محمد حنیف ندوی

ایک آیت

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

اور یہود کہتے ہیں کہ ہمیں جو جہنم کی آگ چھوئے گی، تو بس چند گنتی کے دن ہی کیلئے! کیا گناہوں کے باوجود عذاب میں مبتلا نہ کرنے کا اللہ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے۔ اگر ایسا ہے تب اللہ یقیناً اپنے عہد کے خلاف نہیں کرنے کا۔ یا یہ بات ہے کہ تم ان باتوں میں اللہ پر افترا کر رہے ہو، جسکی بابت تم نہیں جانتے، تمہارا گمان صحیح نہیں جس شخص نے بھی برائی کی اور اس کی برائی نے اس کو گھیر لیا۔ تو یہ بلاشبہ جہنم میں جلنے والوں میں سے ہو گیا جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے نیک کام بھی کئے تو یہ اہل جنت ہوئے جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے ——

یہودیوں کی تعلی : مذہب جب اصلی ماخذ سے دُور ہوتا ہے تب قیاس اور اٹکل کو اپنا راہ نما ٹھہراتا ہے اور ہر اس چیز کو حجت و سند مان لیتا ہے جس سے عوام کی تسکین ہو سکے —— یہودیوں کے پرانے نوشتوں میں یہ بات ہرگز مرقوم نہیں ہے کہ نجات اخروی پر ان کا ہر آئینہ استحقاق ہے اور یہودیت ان کو ہر صورت میں اللہ کی رحمتوں اور بخششوں کا سزاوار بناتی ہے —— بلکہ عہد نامہ قدیم میں بے شمار آئتیں تھیں جن میں سزا اور مکافات عمل کا منصفانہ قانون مذکور ہے اور برابر لکھا ہے کہ گناہ و معصیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی بٹوارہ نہیں۔

اس حد تک البتہ صحیح ہے۔ کہ ان پاک کتابوں میں بھی انسانی دخل اندازیوں اور تحریف نے یہودی قومیت و عصبیت اور یہودی پندار و زعم کی تائید کے لئے بڑی حد تک مسالہ جمع کر دیا ہے اور ممکن ہے کہ اس مسالہ سے اس طرح کی قیاس آرائیوں کے لئے بھی انھیں موقع ملا ہو —— لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ عقیدہ ان کا کوئی مسلمہ تھا یا اس کی بنیاد واقعی کسی آیت پر تھی۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جب علی الاعلان اسلام کے مقابلہ میں اس تعلی کو بیان کیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام کو ماننے اور اپنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ یہودیت ہی نجات کی ضامن ہے اور ہر ہر یہودی کو جنت میں جانا ہی ہے۔ چاہے چند دن پاداشِ عمل کے طور پر جہنم میں بدرجہ اضطرار رہنا پڑے —— تو قرآن نے یہ پوچھ لینا مناسب جانا کہ یہ پندار کس آیت پر مبنی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے کہیں یہودیوں سے اس نوع کا وعدہ کیا ہے —؟

جس کا صاف صاف منشا یہ تھا کہ اس طرح کا کوئی وعدہ یہودیوں سے نہیں ہوا اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ اپنے

بندوں میں یہ تفریق قائم کرے اور اپنے قانون انصاف و عدل کو خواہ مخواہ توڑے ـــــ اس لئے اس قول کا مبنی بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایسا کہنے والے وہی لوگ ہو سکتے تھے۔ جن کا رشتہ ان کے مآخذ دینی سے منقطع ہو چکا تھا اور ان میں ٹھیک ٹھیک دینی تعلیم کی جگہ عصبیت و غرور نے لے لی تھی اور یہ ہمہ گیر قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم مذہب کی رُو سے بیگانہ ہو جائے اور سعی و عمل کی روح سے محروم ہو جائے تب لامحالہ اس انداز کے توہمات اس کے اندر پھیلتے اور مقبول ہوتے ہیں۔ اور وہ کردار و سیرت سے محروم ہونے پر بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس سے کچھ نہیں بگڑا۔ نجات بہر حال ہو ہی جائے گی۔

پاداش عمل کا اصول: قرآن نے پہلے تو نہایت حکیمانہ پیرائے میں یہ بیان کیا کہ یہ لاعلمی کی باتیں ہیں۔ وہ خدا جس کو اپنی پوری مخلوق سے محبت ہے اور جو پوری کائنات انسانی سے یکساں تعلق رکھتا ہے کیونکر ایسا وعدہ کر سکتا ہے۔ ام تقولون علی اللہ مالا تعلمون۔ پھر اس کے بعد معصیت اور پاداش عمل سے متعلق ایک جچا تلا اصول بیان فرمایا کہ نجات کا معاملہ توہمات و ظنون کا معاملہ نہیں عمل و کردار کا معاملہ ہے۔ ان لوگوں کو اس حقیقت پر غور کرنا چاہیئے کہ یہ جس راہ پر گامزن ہیں وہ گناہ و نافرمانی کی راہ ہے یا اللہ کی فرمانبرداری و اطاعت شعاری کی ـــــ پھر ان کو اس چیز پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ یہ جن تصورات کو مان رہے ہیں اور جن خواہشات نفس کا نام انھوں نے یہودیت رکھ چھوڑا ہے اور جس کو نجات اخروی کا یہ واحد وسیلہ قرار دے رہے ہیں، آیا ان کو تقویٰ و پرہیزگاری کی منزل کی طرف لے جا رہی ہے یا ان تصورات اور اس طرح کے پندار و غرور دینی سے ان میں انفرادی اور اجتماعی گمراہیاں پھیل رہی ہیں۔ اگر ان تصورات سے ان کی اشاعت ہوتی ہو، اور ان عقائد و مزعومات کو تسلیم کر کے ان میں خدا ترسی کے پاکیزہ جذبات ابھرتے ہیں ـــــ تب ان کی نجات میں کیا شبہ ہے، لیکن اگر مسخ شدہ یہودیت سے جس میں بجز قومی تعصب و غرور کے اور کسی لطیف جذبہ کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان میں معصیت و گناہ کی چنگاریاں بھڑکتی ہیں اور چاروں طرف سے اللہ کی نافرمانی گھیر لیتی ہے تب صرف اس عنوان اور چھاپ سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ـــــ مذہب کی اصل حقیقت تو نیکی اور پاکبازی ہے۔ اگر ایک شخص دنیا میں اس نعمت سے اس درجہ محروم ہے کہ انفرادی اور اجتماعی چوکھٹوں میں کہیں اصلاح و خیر کے آثار موجود نہیں تو عقبیٰ و آخرت میں کس بل بوتے پر نجات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور اگر ایک پوری قوم کا یہ حال ہو کہ قساوت قلبی اور دنیا طلبی کی گوناگوں خواہشوں نے اس کا احاطہ کر رکھا ہو۔ تو نجات کا حصول اور بھی مستبعد ہو جاتا ہے۔

نحوی لطیفہ: یہاں یہ نکتہ لائق غور ہے کہ اَمْ جس کا ترجمہ اردو میں عموماً "یا" ہے شک اور تردد کے لئے نہیں۔ بلکہ احد الطرفین کے اثبات کے لئے ہے ـــــ اس صورت میں ام کو بَل کے معنوں میں قرار دیجئے اور یوں ترجمہ کیجئے۔ کہ بلکہ تم اللہ پر افترا کرتے ہو ـــــ قرآن میں اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں۔ جیسے حضرت یوسفؑ اپنے جیل کے ساتھیوں سے فرماتے ہیں: ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار (یوسف) کیا مختلف خداؤں کا تصور خوب ہے یا ایک خدائے قاہر کا ـــــ اگرچہ انداز سوال کا ہے مگر مقصود یہی ہے کہ ایک خدائے قہار ہی کا تصور بہتر ہے۔

ایک نکتہ: علامہ جصاص المتوفی ۳۷۰ھ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص دو شرطوں پر اپنی

قسم و یمین کو مبنی ٹھہراتا ہے۔ تو جب تک یہ دونوں شرطیں منتفی نہیں ہو جاتیں۔ شرعاً وہ حانث نہیں ہو گا۔ یعنی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی ــــ کیونکہ یہاں جہنم کے استحقاق کے لئے قرآن حکیم نے دو باتوں کو الگ الگ موجب و سبب قرار دیا ہے۔ ایک کسب سیئہ اور دوسرے احاطہ خطیئات۔ اب اگر صرف کسب سیئہ ہی کا وجود ہے اور احاطہ خطیئات نہیں ہے تو تنہا یہ جہنم و دوزخ کو مستلزم نہیں۔

غور کیجئے گا۔ تو یہ استدلال غلط نظر آئے گا۔ کیونکہ سیئہ سے مراد اس جگہ ایک گناہ نہیں بلکہ گناہ کی مخصوص نوعیت ہے جو بہت سے گناہوں کو مستلزم ہے۔ اس صورت میں کسب سیئہ اور احاطہ خطیئات ایک ہی چیز قرار پاتی ہے۔ دو الگ الگ شرطیں نہیں ــــ خود معاملہ کے نقطہ نظر سے بھی یہ کلیہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ جو دو شرطیں بیان کی گئی ہیں ان کا مزاج کیسا ہے؟ کون ان میں مقصود بالذات ہے اور کون مقصود بالتبع ــــ کون اصلی و حقیقی شرط ہے اور کون اس کا لازمی و منطقی نتیجہ ــــ پھر جو مقصود بالذات اور اصلی و حقیقی شرط ہو گی۔ اس کی خلاف ورزی پر حانث ہو گا۔ اگرچہ دوسری شرط بالفعل نہ ہی پائی جائے۔

قرآن اور علمِ جدید

(مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

اِس کتاب میں آیاتِ قرآنی سے استدلال کر کے مغرب کے اُن تمام نظریات کی علمی اور عقلی تردید کی گئی ہے۔ جو قرآن کو چیلنج کرتے ہیں۔ لیکن دَورِ حاضر میں بالعموم قبول کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء۔ میکڈوگل کا نظریۂ جبلت۔ فرائڈ کا نظریۂ لاشعور۔ ایڈلر کا نظریۂ لاشعور۔ کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت۔ اور میکیاولی کا نظریۂ وطنیت۔ ان نظریات کی تردید کرتے ہوئے مصنف نے فلسفہ اور سائنس کے ان تمام حقائق کو بھی واضح کیا ہے۔ جو رُوحِ قرآن سے مطابقت رکھتے ہیں اور علمی اعتبار سے بھی درست مانے جاتے ہیں۔ اس عمل کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوا کہ علمِ جدید کے سارے طُول و عرض میں سے علمی صداقتیں باطل سے جدا ہو ہو کر اسلام کی تائید کے لئے مہیا ہو گئی ہیں، بلکہ باطل نظریات کی خامیاں بھی واضح ہو گئی ہیں۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے، کہ ارتقا اور لاشعور کے اسلامی نظریات کیا ہیں۔ نیز سیاست اور اقتصادیات کے متعلق اسلام کا کیا تصوّر ہے یہ کتاب نہ صرف مغرب کے باطل نظریات کی تردید ہے، بلکہ اسلامی نظریۂ انسان و کائنات کی ایک مکمل علمی تشریح بھی ہے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ ۲ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان